ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری

ہندوستان کی تحریک آزادی میں دینی مدارس کا حصہ

دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے خصوصی حوالے سے

۱۵؍ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کے افق پر آفتاب حریت طلوع ہوا۔ اور اس آب و تاب سے طلوع ہوا کہ اس نے غلامی کی تمام تر ظلمتوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ یہ ایک ایسا عظیم الشان انقلاب تھا جس کی نظیر معاصر عالمی تاریخ میں ملنی مشکل ہے، اس نے نہ صرف ہندوستان پر، نہ صرف برصغیر ایشیا پر، بلکہ پوری دنیا پر بڑے دور رس اثرات مرتب کیے۔ اس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ یہ پر امن اور عدم تشدد کی بنیاد پر چلائی گئی تحریکات اور جدوجہد کا ثمر شیریں تھا۔ لیکن یہ نوے سالہ تحریک جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندوستانی قوم کی ناکامی کے بعد از سر نو شروع ہوئی تھی۔ اپنے جلو میں قربانیوں اور مصائب کی ایک طویل اور لامتناہی داستان رکھتی ہے۔ یہ داستان ہندوستانی عوام کی امن پسندی اور ہر حال میں عدم تشدد پر قایم رہنے کے غیر متزلزل یقین و اعتقاد اور حکمراں طبقہ کے لڑاؤ اور حکومت کرو اور عوام کے جذبۂ حریت کو پُر تشدد انداز سے کچلنے اور اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لیے ہر قسم کے تشدد کو روا رکھنے اور آلام و مصائب میں مبتلا رکھنے کے انسانیت سوز نظریہ پر سختی سے عمل کرنے کی داستان ہے۔ یہ وہی صورت حال تھی جس کے بارے میں مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا تھا۔

خدا ثابت قدم رکھے ہمیں اس آزمائش میں
اُدھر ہیں گولیاں اُن کی، اِدھر سینے ہمارے ہیں

۱۸۵۷ء کی آزادی کی جنگ ہندوستانی عوام نے مشترک طور پر لڑی۔ اس میں ہر مذہب، ہر مسلک اور ہر قوم کے افراد شامل تھے۔ اس میں سب کا برابر کا حصہ تھا، لیکن اس جنگ میں ہندوستانیوں کی ناکامی کے بعد انتقامی ظلم و ستم اور جبر و استبداد کا نشانہ خصوصیت سے مسلمانوں کو بنایا گیا اس لیے کہ ۱۸۵۷ء میں علم بغاوت پہلے مسلمانوں نے ہی بلند کیا تھا۔ پھر حکومت چوں

کر مسلمانوں سے ہی چھینی گئی تھی اس لیے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کی غرض سے بھی مسلمانوں کے استحصال اور من حیث القوم ان کی تباہی و بربادی کا سامان فراہم کیا گیا۔ ان کو سردار لٹکایا گیا، ان کی املاک پر قبضہ کرلیا گیا اور انہیں نان شبینہ سے محتاج کردیا گیا اور چوں کہ انگریزوں کے خلاف اس تحریک میں علمائے کرام قائدانہ رول ادا کررہے تھے اس لیے ان کو بھی خصوصی طور پر ظلم وتشدد کا ہدف بنایا گیا۔ معاصر تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ ایک محتاط اندازے کے مطابق کم از کم دس ہزار علماء کو تختۂ دار کی زینت بنایا گیا۔ ان کے علاوہ عام مسلمانوں میں کتنے لوگوں کو تہہ تیغ کیا گیا اور ابدی نیند سلایا گیا، اس کا اندازہ کرنا آج ہمارے لیے ممکن نہیں، ان پر ظلم وستم اور آلام ومصائب کے جو پہاڑ توڑے گئے، ان کا تصور کرکے ہی ہمارے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ اپنے وطن عزیز کے لیے ان کی بے مثال قربانیوں کو یاد کرکے ہمارا سر فخر سے بلند بھی ہوجاتا ہے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

لیکن اس اندوہناک اور ہوش رُبا تباہی وبربادی اور آلام ومصائب کے باوجود علمائے کرام نے ہار نہیں مانی، نہ پست ہمت ہوئے بلکہ حالات کے معمول پر آنے کے فوراً بعد اپنی تمام تر صلاحیتوں، قوتوں اور وسائل کو مجتمع کرکے از سر نو برسرپیکار ہوگئے۔ لیکن ایک بنیادی فرق کے ساتھ۔ انہوں نے محسوس کیا کہ حکمراں طبقہ جدید آلات اور جدید ہتھیاروں سے لیس ہے جن کا مقابلہ نہتے ہندوستانی نہیں کرسکتے اس لیے انہوں نے بالمشافہ اور براہ راست محاربہ آرائی کے بجائے بالواسطہ مقابلہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کے لیے انہوں نے مسلمانوں کی بازآبادکاری اور معاشی ومعاشرتی حالت کو سدھارنے کے ساتھ انہیں زیور علم سے آراستہ کرنا بھی ضروری تصور کیا۔ اور چوں کہ ان کے نزدیک عنان حکومت جن لوگوں کے ہاتھ میں آئی تھی وہ مسلم کش، اسلام دشمن اور وطن دشمن تھے، اس لیے ان کے چنگل سے وطن عزیز کو آزاد کرانا اور اس کے لیے جدوجہد کرنا مسلمانوں کے مذہبی فرائض میں شامل تھا، اس لئے تحریک آزادی کو مذہبی بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے مذہبی تعلیم کو عام کرنا ضروری تصور کیا گیا۔ اس مقصد کے حصول کی غرض

سے انہوں نے ملک کے طول وعرض میں شبینہ مکتبوں، مدرسوں اور اسلامی درس گاہوں کا ایک جال بچھادیا۔ ان میں جن مدارس نے ہندوستان گیر نہیں، بلکہ بین الاقوامی شہرت حاصل کی اور جن کے فرزندوں نے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کی اور بے مثال قربانیاں پیش کیں اُن میں دارالعلوم دیوبند (١٨٦٦ء)، مظاہرالعلوم سہارنپور (١٨٦٦ء)، مدرسہ عالیہ عربیہ۔ مسجد فتحپوری دہلی (١٨٧٢ء) مدرسہ شاہی، مرادآباد (١٨٧٨ء)، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو (١٨٩٨ء)، جامعہ اسلامیہ عربیہ، امروہہ (ضلع مرادآباد) (١٨٨٦ء)، جامعہ عربیہ احیاء العلوم، مبارکپور (ضلع اعظم گڑھ) (١٨٩٩ء) اور مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر (اعظم گڑھ) (١٩٠٩ء) کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ یہ وہ درس گاہیں ہیں جو انیسویں صدی کے اخیر تک قایم ہوگئی تھیں۔ بیسویں صدی میں قایم ہونے والے مدارس کی تعداد شمار سے باہر ہے۔

<u>دارالعلوم دیوبند</u> = دارالعلوم دیوبند کا قیام ایک تاریخ ساز اور عہد آفریں عمل تھا جس کے بڑے مثبت اور دوررس نتائج مرتب ہوئے اور جس سے تحریک پاکر بہت سے دوسرے دردمندان قوم اور بہی خواہان ملت نے اپنے اپنے حلقوں میں مدارس قایم کیے اور جو تحریک قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی، بانی دارالعلوم دیوبند نے شروع کی تھی اس کو آگے بڑھایا۔ دارالعلوم دیوبند کا قیام ٣٠ رمئی ١٨٦٦ء کو عمل میں آیا۔ اس طرح گویا ہندوستانی مسلمانوں کی دینی، علمی، تہذیبی اور بڑی حد تک سیاسی زندگی کی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ دارالعلوم کے پہلے مدرس ملا محمود دیوبندی تھے اور پہلے طالب علم محمود حسن بن ذوالفقار علی دیوبندی تھے جو بعد میں شیخ الہند کے پاک لقب سے مشہور ہوئے۔ یہ اجتماع محمودین پوری مسلم قوم کے لیے بڑا ہی مبارک اور مسعود ثابت ہوا۔ اسی کے طفیل دارالعلوم نے تیزی سے ارتقائی مراحل طے کیے اور جلد ہی ایک بین الاقوامی ادارہ بن گیا۔ اس کے فرزندوں نے نہ صرف ہندوستان، بلکہ افغانستان، حجاز مقدس اور دیگر ممالک اسلامیہ میں تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کے فرایض انجام دیے۔ اسی کے ساتھ ان حضرات نے اپنے وطن عزیز کو آزاد کرانے کی جدوجہد بھی کی اور ملک میں چل رہی تحریک کو نہ صرف تقویت بخشی، بلکہ قائدانہ رول بھی ادا کیا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے شیخ الہند نے ١٨٧٨ء میں ثمرۃ التربیۃ کے نام سے ایک تنظیم کی تشکیل دی جس میں ابتداءً فضلائے دارالعلوم شامل تھے، لیکن رفتہ

رفتہ رفتہ اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، اور علی برادران جیسے عمائد ملت بھی اس سے وابستہ ہو گئے۔

جمعیۃ علماء کا قیام = ثمرۃ التربیۃ نے اگرچہ کافی نمایاں کارنامے انجام دیے اور تحریک آزادی کو آگے بڑھایا، تاہم بعض وجوہ سے یہ زیادہ عرصہ تک برسرکار نہ رہ سکی اور پردۂ خفا میں چلی گئی۔ لیکن جلد ہی ایک مزید فعال اور زیادہ وسیع تنظیم کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ چنانچہ علمائے کرام نے باہمی مشورے سے ایک نئی جماعت تشکیل دی۔ اس کا تاسیسی اجلاس ۲۸ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر کے تاریخی شہر میں منعقد ہوا۔ اس کی صدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے فرمائی۔ اس سلسلہ کا دوسرا اجلاس اُسی دن سہ پہر میں مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ اور اس طرح ایک نئی مذہبی و سیاسی جماعت وجود میں آئی جس کا نام جمعیۃ علماء ہند رکھا گیا۔ اور جس نے نہ صرف آزادی سے قبل بلکہ آزادی کے بعد بھی تقسیم ملک کے ہولناک عمل سے متاثر بے یار و مددگار اور فرقہ وارانہ فسادات کے لامتناہی سلسلہ سے خستہ حال، خستہ جگر اور آزردہ دل مسلمانوں کی دلجوئی و دل جمعی، بازآبادکاری، معاشی بہتری اور دینی تعلیم کے نظم کے سلسلہ میں جو کوششیں کیں وہ قابل فخر اور قابل یادگار ہیں۔ جمعیۃ نے قائم ہوتے ہی میدان سیاست میں قدم رکھا۔ اس وقت ملکی سیاست میں انڈین نیشنل کانگریس پیش پیش تھی اور چوں کہ سیاسی مقاصد میں جمعیۃ اور کانگریس میں بڑی حد تک یکسانیت تھی اس لیے سیاسی سطح پر کانگریس سے اتحادِ عمل کو قرینِ مصلحت سمجھا گیا۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہ ہوگا کہ یہ دونوں جماعتیں یکسر شیر و شکر یا ایک جان اور دو قالب ہو گئی تھیں۔ بلکہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ جب بھی کانگریس کا طریق کار یا اس کی حکمت عملی جمعیۃ کے مزاج یا مقاصد سے ٹکرائی ہے، جمعیۃ نے فی الفور اسے آگاہ کیا اور رشتۂ تعاون توڑ کر تنہا ہی اپنی راہ پر گامزن ہو گئی۔ اس کی سب سے بڑی مثال نہرو رپورٹ کی مخالفت ہے۔ ۱۹۲۸ء میں جب یہ رپورٹ منظر عام پر آئی تو اس کو ملک کے عظیم تر مفاد کے لیے مضر سمجھتے ہوئے اکابر جمعیۃ نے اس کو نامنظور کر دیا اور چوں کہ کانگریس کے رہنماؤں کا بڑا طبقہ اس رپورٹ کی حمایت کر رہا تھا، اس لیے جمعیۃ نے کانگریس سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔ لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ۱۹۲۹ء میں جب خود کانگریس

نے اسے مسترد کر کے دریا بُرد کر دیا، تو جمعیۃ پھر کانگریس کے قریب آ گئی اور ایک تجویز پاس کر کے اپنے موقف کی ان الفاظ میں وضاحت کی:

> ''چوں کہ کانگریس نے لاہور میں مکمل آزادی کا اعلان کر دیا ہے اور نہرو رپورٹ کو خارج کر دیا ہے اس لیے جمعیۃ علماء کانگریس سے الگ نہ رہے، بلکہ اس کے ساتھ اشتراک عمل کرے۔''

جمعیۃ کے اکابر بالخصوص شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا ابوالمحاسن سجاد، مولانا محمد علی جوہر، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا محمد میاں، شیخ الحدیث مولانا فخرالدین صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے عوامی خدمت کو بھی اپنا نصب العین بنایا اور جد و جہد آزادی کے سلسلہ میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور ہر طرح کی قربانیاں پیش کیں۔ انہوں نے ہر مرحلہ اور ہر ممکن طریقہ پر قومی یک جہتی اور ہندو مسلم اتحاد کو برقرار رکھنے کی صدق دلی سے کوشش کی اور بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ بیسویں صدی میں حصول آزادی کے لیے کانگریس نے جتنی بھی تحریکیں شروع کیں، جمعیۃ نے ان سب کی نہ صرف حمایت کی، بلکہ عملی طور پر بھی ان میں شرکت کی اور بڑھ چڑھ کر قربانیاں بھی دیں۔

جمعیۃ کے اکابر کا یہ بھی ایک عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے فرقہ وارانہ سیاست سے خود کو کبھی ہم آہنگ نہیں کیا۔ اسی لیے انہوں نے مسلم لیگ کے دو قومی نظریے کی دل و جان سے مخالفت کی اور تقسیم ملک کے مطالبہ کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اس کی پاداش میں ان کو خود اپنے ہم مذہبوں کے طعن و تشنیع اور ہتک آمیز سلوک کا شکار بھی ہونا پڑا لیکن اس مرحلہ پر بھی وہ ثابت رہے اور پائے ثبات کو لغزش نہ ہونے دی۔ اُن کی دور بیں نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ ملک کی تقسیم برصغیر کے مسلمانوں کے مختلف النوع مسائل کا حل نہیں ہے، بلکہ اس سے تو ان کو ناقابل تلافی نقصان ہوگا اور ان کے مسائل مزید پیچیدہ اور وقت طلب ہو جائیں گے۔ اور آج جب ہم پورے برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی، معاشی اور تعلیمی صورت حال پر نظر کرتے ہیں تو ہمیں مایوسی اور شکستہ دلی کے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آتا۔ اس وقت ہمیں ان انفاس قدسی کی دور بینی، دور اندیشی، خلوص و صداقت اور سیاسی بصیرت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف اپنے

جلسوں اور اپنے حلقوں میں اس کی مخالفت کی، بلکہ کانگریس کے اجلاسوں میں بھی تقسیم ملک کے منصوبہ کو منظور کر لینے کی اس کی حکمت عملی پر شدید نکتہ چینی کی اور اس فیصلہ کو افسوسناک اور تباہ کن قرار دیا۔ حتیٰ کہ ۱۰ر جون ۱۹۴۷ء کو دہلی میں کانگریس کا جو تاریخی اجلاس منعقد ہوا تھا، جس میں تقسیم ملک کی قرارداد کو باقاعدہ طور پر منظور کیا گیا تھا، اور جس میں کانگریس کے تمام صف اول کے رہنما موجود تھے اور قرارداد کی حمایت میں تقریریں کر رہے تھے، اس میں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن، ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند کی ہی واحد ذات تھی جس نے انتہائی واضح، مدلل اور پرزور الفاظ میں اس تجویز کی مخالفت کی اور اس کی حمایت کرنے والوں کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اور بقول مولانا محمد میاں:

> ''اجلاس میں شریک ہونے والے ممبروں میں سے ممکن ہے بہت سے ممبر اس تجویز کے حامی نہ ہوں مگر اول تو ہائی کمانڈ کی مخالفت کسی بھی موقع پر آسان نہیں، خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ پوری فضا ایک رنگ میں رنگی ہوئی ہو، اس کی مخالفت میں صرف وہی شخص آواز اٹھا سکتا ہے جو لایخافون لومۃ لائم کا پیکر اور اس کا صحیح مصداق ہو اور جس کی صداقت پسندی ہر ایک مرعوبیت سے آزاد ہو۔''(۱)

دارالعلوم ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ:

مسلمانوں کی دوسری اہم اور عظیم دینی درس گاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء ہے جسے اب بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ یہ درس گاہ خطۂ بہار کی انتہائی مقتدر اور باعظمت شخصیت مولانا محمد علی مونگیری کی تحریک پر ۱۸۹۸ء میں قائم ہوئی تھی۔

اس کا تاسیسی جلسہ مدرسہ فیض عام کانپور میں ۲۲ر تا ۲۴ر اپریل ۱۸۹۴ء کو منعقد ہوا۔ اس میں ہندوستان بھر کے منتخب اور مقتدر علماء اور اہل نظر اور صاحب بصیرت حضرات نے شرکت فرمائی اور انجمن ندوۃ العلماء کی تشکیل کا حتمی فیصلہ لیا۔ ان دردمندان ملت میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا حکیم فخرالحسن گنگوہی، مولانا شاہ محمد حسین دیسنوی، مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی اور خود مولانا محمد علی مونگیری، جیسی یایہ ناز ہستیاں

۱۔ محمد میاں: علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے (حصہ دوم) ص ۳۳۶

شامل تھیں۔ ان حضرات نے ندوہ کے حسب ذیل مقاصد متعین کیے:

(۱) علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں دور رس اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔

(۲) ایسے علماء پیدا کرنا جو کتاب وسنت کے وسیع وعمیق علم کے ساتھ جدید خیالات سے بخوبی واقف اور زمانے کے نبض شناس ہوں۔

(۳) اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا۔

(۴) اسلامی تعلیمات کی اشاعت، بالخصوص برادران وطن کو اس کی خوبیوں سے روشناس کرانا۔

ان کی تشریح کرتے ہوئے مولانا علی میاں فرماتے ہیں:

اس انجمن نے جن بنیادوں پر اپنے سفر کا آغاز کیا، وہ تھیں:

> ''مسلمانوں کا باہمی اتحاد، اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لیے مختلف اجتماعی، اسلامی وتعلیمی کوششوں میں ہم آہنگی، اعلیٰ سیرت وکردار کی تشکیل، رسوم قبیحہ کا استیصال، مسلمانوں کے مختلف امور ومسائل کے حل کے لیے مختلف مسلک ومشرب کے صحیح العقیدہ (اہل سنت والجماعت) علماء کے ایک مشترکہ پلیٹ فارم کی تشکیل، اسلامی اصولوں اور شریعت اسلامی کے مقاصد کو سامنے رکھ کر علوم دینیہ کے نصاب میں ایسی تبدیلیاں جو عصر حاضر کے تقاضوں کی تکمیل کر سکیں، علماء کی دینی سطح کو بلند اور ان کے فکر ومعلومات کے افق کو وسیع کرنا اور ایسے علماء تیار کرنا جو قدیم وجدید دونوں طبقوں کے اعتماد کے اہل اور احترام کے مستحق ہوں اور وہ مسلمانوں کی دینی، فکری، علمی قیادت کے اس منصب پر فائز ہو سکیں جو عرصہ سے خالی چلا آرہا ہے۔''(۱)

علماء کی جس تحریک کو بہار کی جس مقتدر، سربرآوردہ اور پراثر روحانی شخصیت یعنی مولانا محمد علی مونگیری کی سرپرستی میں شروع کیا گیا تھا۔ اس نے جلد ہی مقبولیت حاصل کر لی اور علماء کے ہر طبقہ ومسلک اور ملک کے طول وعرض کے دیگر ہمدردان ملت اس سے وابستگی اختیار کرنے لگے اور اس طرح کارواں بنتا گیا۔ جن حضرات نے ابتدا ہی میں اس سے تعلق قائم کیا

۱۔ پیش لفظ (تاریخ ندوۃ العلماء، حصہ اول: مؤلفہ محمد اسحاق جلیس) ص ۱۱۔

ندوۃ العلماء کے فرزندوں میں جنہوں نے علوم اسلامی، ادب و انشاء، فن خطابت میں نام پیدا کیا اور انتہائی اہم تصنیفات و تالیفات بطور یادگار چھوڑیں ان میں علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، شاہ معین الدین ندوی، ریاست علی ندوی، سید ابوظفر ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، جیسی مایۂ ناز اور لائق صد افتخار ہستیاں شامل ہیں۔

ندوۃ العلماء نے براہ راست ملکی سیاست میں حصہ نہیں لیا، لیکن اسے شجر ممنوعہ بھی قرار نہیں دیا۔ چنانچہ اس کے اکابر اور سرپرست، نیز اس کے فرزندوں نے بھی مختلف سیاسی اور مذہبی جماعتوں سے منسلک ہو کر عصری سیاست میں حصہ لیا، بالخصوص ۱۹۴۷ء سے قبل کانگریس پارٹی اور جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے ہندوستان کی آزادی کے لیے کوششیں کیں اور تحریک آزادی کو تقویت بخشی۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں نام علامہ شبلی نعمانی اور ان کے شاگرد رشید علامہ سید سلیمان ندوی کا نظر آتا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی تحریک ندوۃ العلماء سے ابتدا ہی سے منسلک ہو گئے تھے۔ انہوں نے پہلی بار ندوہ کے دوسرے اجلاس منعقدہ ۱۲، ۱۳، ۱۴ اپریل ۱۸۹۵ء بمقام لکھنؤ میں شرکت کی تھی اس وقت وہ علی گڑھ کالج میں عربی کے پروفیسر تھے اور سرسید کی تعلیمی تحریک کے پُرجوش موئید اور مبلغ کی حیثیت سے ہندوستان بھر میں مشہور تھے۔ وہ طبقۂ علماء سے تعلق رکھنے کے باوجود، جدید تعلیم کے بھی زبردست حامی اور قدیم طرز کی تعلیم میں تبدیلی کے خواہاں بھی۔ اس طرح ان کی شخصیت قدیم اور جدید میں سنگم کی حیثیت رکھتی تھی۔ جدید تعلیم کی کشش انہیں علی گڑھ لے کر گئی اور قدیم طرز تعلیم نیز "علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں دور رس اور بنیادی اصلاحات" کے نظریے نے انہیں ندوہ کی تحریک سے وابستہ کر دیا۔ وہ اس کے ایک فعال رکن بنے، پھر رکن رکین کی حیثیت اختیار کر لی، پھر جلد ہی اس کے سرپرستوں اور اکابر کی صف میں جگہ بنالی۔ چنانچہ ۶ جنوری ۱۹۰۳ء کو ندوہ کا جو اجلاس مدارس میں منعقد ہوا تھا اس کی صدارت علامہ نے ہی فرمائی تھی۔ اس وقت وہ ریاست حیدرآباد میں ناظم سررشتۂ علوم و فنون کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے۔ اس کے بعد وہ مستقلاً لکھنؤ منتقل ہو کر ہمہ وقت ندوۃ العلماء کی خدمت میں لگ گئے۔ پہلے وہ ندوہ کے ترجمان ماہنامہ الندوہ کے ایڈیٹر بنائے گئے اس کے بعد وہ ندوۃ العلماء کی مسند نظامت پر رونق افروز ہوئے اور ۱۹۱۳ء تک اس اہم منصب پر فائز رہے۔ آپ کا زمانۂ نظامت اگرچہ کافی ہنگامہ خیز تھا، تاہم اس میں ندوہ کو غیر معمولی ترقی بھی نصیب ہوئی۔

کشاف اور وصاف کے فرضی نام سے شائع ہوئیں۔

ندوہ اسکول کی دوسری اہم شخصیت مولانا سید سلیمان ندوی کی ہے۔ مولانا زبردست عالم دین، مصنف، خطیب، بہترین ادیب، اور انشاء پرداز تھے۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں آپ کے کارنامے سنہرے حروف سے تحریر کرنے کے لائق ہیں۔ آپ علامہ شبلی کے شاگرد رشید اور علمی و تصنیفی میدان میں ان کے سچے جانشین بھی تھے۔ آپ نے علمی و ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ملکی سیاست میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ اور ملت کی رہنمائی کے فرائض انجام دیے۔ آپ نے تحریک خلافت کے زمانے میں عملی سیاست میں قدم رکھا اور بقول مولوی شمس تبریز خاں:

> جنگ عظیم کے نتائج پر خلافت عثمانیہ [ترکی] اتحادی فوجوں کے نرغے میں تھی۔ اس کی دادرسی اور تقویت و تائید کے لیے مولانا عبدالباری فرنگی محلی، علی برادران اور دوسرے علماء و مسلم عمائد کی کوششوں سے ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت کی بنیاد پڑی جس کے اولین کارگزاروں اور سرگرم حامیوں میں ہمارے مولانا سید سلیمان ندوی بھی تھے۔
>
> مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر کی تحریروں کے ساتھ سید صاحب کے علمی و تاریخی رسالوں: دنیائے اسلام اور مسئلہ خلافت" اور "خلافت عثمانیہ اور دنیائے اسلام" نے اس تحریک کو بڑی تقویت پہنچائی اور اس کے لیے قیمتی علمی مواد فراہم کیا۔" (۱)

فروری ۱۹۲۰ء میں ہندوستان سے جو وفد ترکی گیا تھا، اس کے رکن مولانا سید سلیمان ندوی بھی تھے اور اس طرح وہ گویا وفد میں طبقۂ علماء کی نمائندگی کر رہے تھے۔ مولانا کے صائب مشوروں سے وفد کو اپنے مشن کو آگے بڑھانے اور اسے کامیابی سے ہم کنار کرانے میں بڑی مدد ملی۔

ہندوستان واپس آکر مولانا نے خلافت تحریک کو عوام و خواص میں مقبول بنانے میں بڑا اہم کردار کیا۔ ۱۹۲۳ء میں آپ نے بہار خلافت کانفرنس کے اجلاس کی صدارت فرمائی اور ۱۹۲۶ میں کل ہند خلافت کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی میں بھی آپ ہی نے مسند صدارت کو رونق بخشی۔

۱۔ تاریخ ندوۃ العلماء (حصہ دوم) ص ۴۷۳-۴۷۳

مولانا جمعیۃ علماء ہند سے بھی ابتدا ہی سے وابستہ رہے اور آزادی وطن کے لیے شروع کی گئی ہر تحریک میں آپ کی نہ صرف حمایت حاصل رہی، بلکہ ان تمام تحریکوں میں عملی طور پر شریک بھی رہے۔ آپ کی مخلصانہ کوششوں، وطن عزیز کی آزادی کے لیے آپ کی تڑپ، ہندو مسلم اتحاد میں آپ کے غیر متزلزل یقین اور طبقۂ علماء سے آپ کی گہری عقیدت اور علماء کا آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر ۱۹۲۶ء میں جمعیۃ علماء کا جو تاریخ ساز ساتواں سالانہ اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا تھا، اس کی صدارت کے لیے بھی علمائے کرام نے متفقہ طور پر آپ ہی کو منتخب کیا تھا۔ اس زمانے میں یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس جلسہ کی تاریخی حیثیت یہ ہے کہ اس میں پہلی بار ملک کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا گیا۔ ایک تجویز میں کہا گیا تھا کہ:

> ''مسلمان اپنے بل پر ملک کو آزاد کرائیں۔ البتہ جو غیر مسلم حضرات اس بارے میں اتحاد کرنا چاہیں، ان کے ساتھ اتحاد عمل کیا جائے۔''

علی گڑھ کالج: ۱۸۷۵ء میں سرسید کی کوششوں سے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قایم ہوا جس نے ترقی کر کے ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی کا درجہ حاصل کیا جو آج ساری دنیا میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا ماضی انتہائی شاندار رہا ہے، اسی لیے حال بھی تابناک ہے اور مستقبل بھی ان شاء اللہ اس سے زیادہ روشن اور تابندہ رہے گا۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے نتیجہ میں ہندوستان کے عوام، بالخصوص مسلمان جس صورت حال سے دوچار ہوئے اور جن ہوشربا اور مایوس کن حالات کا انھیں شکار ہونا پڑا، ان سے نبرد آزما ہونے، اپنے پیروں پر کھڑے ہونے، خود اعتمادی بحال کرنے اور از سرنو شاہراہ ترقی پر گامزن ہونے کا جو نسخہ بانی دارالعلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی نے تجویز کیا تھا، بعینہ وہ نسخہ بانی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج سرسید علیہ الرحمۃ نے بھی تجویز فرمایا، اور جو تدبیر مولانا نانوتوی نے اختیار کی وہی تدبیر سرسید نے بھی اختیار کی لیکن ایک بنیادی فرق کے ساتھ۔ دونوں نے مسلمانوں کے مسائل کا حل تعلیم میں تلاش کیا۔ اول الذکر نے مذہبی تعلیم میں جب کہ موخرالذکر نے علوم جدیدہ کی تعلیم میں۔ دونوں کے فکری سرچشمے ایک تھے۔ اس لیے دونوں کے تجویز کیے ہوئے نسخوں میں بنیادی طور پر مماثلت پائی جاتی ہے۔ لیکن حالات اور مصلحت وقت نے دونوں کو الگ الگ راستوں پر چلنے کے لیے مجبور کر دیا لیکن منزل دونوں کی ایک ہی رہی۔ مولانا نانوتوی دارالعلوم دیوبند سے

علماء کی ایک ایسی جماعت تیار کرنا چاہتے تھے جو ملک کے طول و عرض میں پھیل کر اپنے ہم وطنوں کو آزادی کی برکتوں سے روشناس کرائے اور انھیں غیر ملکی تسلط کے خلاف جدو جہد پر آمادہ کرے۔ اس کے برخلاف سرسید کا خیال تھا کہ ہندوستانی قوم ابھی اس قابل نہیں ہے کہ وہ انگریزوں کی طاقتور حکومت سے ٹکر لے سکے۔ اسی لیے انہوں نے اپنی قوم کو عصری سیاست سے دور رہنے اور صرف تعلیم کی طرف توجہ کرنے کا مشورہ دیا۔ ان کا کہنا تھا:

> ''اے صاحبو! جن لوگوں کا خیال ہے کہ پولیٹکل امور پر بحث کرنے سے ہماری قومی ترقی ہوگی، میں ان سے اتفاق نہیں کرتا، بلکہ تعلیم اور صرف تعلیم ہی کو ذریعہ قومی ترقی کا سمجھتا ہوں۔ ہماری قوم کو اس وقت بجز قومی تعلیم کے اور کسی چیز پر کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہماری قوم میں تعلیم کی کافی ترقی ہو جائے گی تو ہم کو وہی کافی ذریعہ تنزل کی حالت سے نکلنے کا ہوگا۔''

اس کے علاوہ انہوں نے ایک اور جگہ فرمایا:

> ''دوستو! .... میں سچ کہتا ہوں کہ جو چیز تم کو اعلیٰ درجہ پر پہنچانے والی ہے وہ صرف ہائی ایجوکیشن ہے۔ جب تک ہماری قوم میں ایسے لوگ پیدا نہ ہوں گے ہم ذلیل رہیں گے اور ان سے پست رہیں گے اور اس عزت کو نہیں پہنچیں گے جس پر پہنچنے کو ہمارا دل چاہتا ہے۔''

اسی لیے انہوں نے اپنے قایم کردہ کالج میں سیاست کو شجر ممنوعہ قرار دیا اور ملک کی ہر سیاسی تحریک اور ہر سیاسی جماعت کی مخالفت کی۔ لیکن اس کے باوجود خود ان کے رفقا اور پھر کالج کے فارغ التحصیل طلبا میں سے ایک بڑی تعداد ایسے حضرات کی بھی نکلی جنہوں نے سیاسی امور میں ان سے اختلاف کیا اور ملکی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کے رفقاء میں علامہ شبلی اور مولانا حالی کے اسماء گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علامہ شبلی کا تذکرہ تو گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے۔ یہاں سرسید کی سیاسی حکمت عملی کے بارے میں ان کا ایک قطعہ پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

کوئی پوچھے تو میں کہہ دوں گا ہزاروں میں یہ بات   روش سید مرحوم خوشامد تو نہ تھی

ہاں مگر یہ ہے کہ تحریک سیاسی کے خلاف   ان کی ہر بات میں آورد تھی، آمد تو نہ تھی
اسی طرح مولانا حالی نے بھی سرسید کے سیاسی خیالات سے کبھی اتفاق نہ کیا جس کا ثبوت ہمیں ان کی مختلف نظموں سے مل جاتا ہے۔

ان بزرگ ہستیوں کے علاوہ کالج کے فرزندوں نے بھی بڑی تعداد میں سیاست میں حصہ لیا اور ملک کی آزادی کے لیے جد وجہد کی۔ اس کے لیے پہلے کالج کی انتظامیہ کے عتاب کا شکار ہوئے اور پھر حکومت وقت کے ظلم وتشدد کا نشانہ بنے۔ ان فرزندوں میں وہ سردان کار بھی تھے جنہوں نے سرسید کی آنکھیں دیکھی تھیں اور ان کی حیات میں ہی کالج سے فارغ ہو گئے تھے۔ ان میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، راجہ مہندر پرتاپ، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں، خوشی محمد ناظر اور مولانا طفیل احمد منگلوری شامل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے کارنامے اتنے زیادہ روشن اور ملک کے لیے ان کی خدمات اتنی معروف ہیں کہ ان پر یہاں تفصیل سے روشنی کی ضرورت نہیں۔ البتہ مولانا محمد علی کی تقریروں سے دو اقتباس پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایک تقریر میں فرماتے ہیں:

> ہم یہاں اس لیے نہیں جمع ہوئے ہیں کہ دو زانو جھک کر یہ درخواست کریں کہ ہم کو جیل خانوں سے آزاد کر دو، ہم کو پھانسی کے تختے سے بچالو۔ میں اپنے لیے اپیل نہیں کرتا۔ مجھے چند آدمیوں کی رہائی کی فکر نہیں ہے۔ ہم چند آدمیوں کو آزاد کرا کے سارے ملک کو غلام نہیں بنانا چاہتے۔ میں اس ملک کے نام پر بول رہا ہوں جس کی آزادی ہم کو بہت عزیز ہے، بہ نسبت کسی شخص واحد کی آزادی کے، خواہ اس کی پوزیشن اور حیثیت کتنی ہی اعلیٰ اور بڑی کیوں نہ ہو۔
>
> میں ضرور جیل بھیج دیا جاؤں، مسز تلک اگر ضرورت ہو تو تیسری مرتبہ جیل خانہ روانہ کر دیے جائیں، مسز بیسنٹ دوبارہ نظر بند کر دی جائیں، بلکہ اس بڑھاپے میں، اگر ضرورت ہو تو، ان ہی کے بالوں سے جکڑ کر ان کو پھانسی دے دی جائے۔ لیکن ہندوستان کو آزاد ہونے دیجیے، تاکہ کوئی شخص آئندہ ہندوستانی مرد اور عورت کے بارے میں یہ نہ کہہ سکے کہ تو پیدائشی غلام ہے۔"

واضح رہے کہ مولانا نے یہ معرکۃ الآرا اور ولولہ انگیز تقریر اس وقت کی تھی جب وہ تقریباً چار سال اور آٹھ ماہ جیل میں گزار کر رہا ہوئے تھے اور بجائے گھر جانے کے سیدھے امرتسر پہنچے تھے جہاں کانگریس کا ۲۶واں سالانہ اجلاس موتی لال نہرو کی صدارت میں منعقد ہو رہا تھا۔ گویا اتنے طویل قید وبند کی صعوبتیں بھی ان کی ہمت کو پست اور عزائم کو متزلزل نہ کر سکی تھیں۔

اب ان کی دوسری تقریر کا اقتباس ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

> "آج جس مقصد کے لیے میں یہاں آیا ہوں، وہ یہی ہے کہ میں اپنے ملک کو اسی حالت میں واپس جاؤں جب کہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو۔ میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا۔ میں ایک غیر ملک میں جب تک کہ وہ آزاد ہے، مرنے کو ترجیح دوں گا۔ اور اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے، تو پھر آپ کو یہاں مجھے قبر کے لیے جگہ دینی پڑے گی۔"

یہ الہامی تقریر جس کا ایک ایک حرف ہر محب وطن ہندوستانی کے قلب پر تعویذ کی طرح کندہ رہنا چاہیے، مولانا نے ۳۰ جنوری ۱۹۳۱ء کو گول میز کانفرنس منعقدہ لندن میں کی تھی۔ اور یہ سچ ہے کہ انہوں نے اپنی بات کی مکمل پاسداری کی اور غلام ہندوستان واپس آنے پر آزاد انگلستان میں موت کو ترجیح دی۔ اسی رات ان کا لندن میں انتقال ہو گیا۔ ایسے سچے محب وطن، قول کے پکے اور عزم صمیم کے لوگ دنیا میں کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

ان کی ناگہانی موت پر انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے نیتاجی سبھاش چندر بوس نے صحیح فرمایا تھا:

> "مولانا ایک بلند ارادہ اور عدیم النظیر قائد تھے جو صف اول میں مصروف جنگ تھے۔ آپ کی سرگرمیاں صرف مادر وطن تک ہی محدود نہ تھیں، بلکہ آپ کی نگاہ وسیع تر تھی اور اتحاد مشرق آپ کی زندگی کا خواب

بہت ہی مشہور اور مقبول نظم ہے: 'پیغام بیداری' جس میں انہوں نے عوام کو مشورہ دیا ہے کہ وہ خواب غفلت سے جاگیں اور متحد ہو کر ملک میں نیا انقلاب لائیں اور غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر پھینک دیں۔ اس کا ایک بند ملاحظہ ہو۔ کہتے ہیں:

اٹھو ہند کے باغبانو! اٹھو　　اٹھو انقلابی جوانو! اٹھو
کسانو اٹھو! کامگارو! اٹھو　　نئی زندگی کے شرارو! اٹھو
اٹھو کھیلتے اپنی زنجیر سے　　اٹھو خاک بنگال و کشمیر سے
اٹھو، کھل گیا پرچم انقلاب　　نکلتا ہے جس طرح سے آفتاب
اٹھو برق کی طرح، ہنستے ہوئے　　کڑکتے، گرجتے، برستے ہوئے
غلامی کی زنجیر کو توڑ دو
زمانہ کی رفتار کو موڑ دو

<u>جامعہ ملیہ اسلامیہ</u> = جامعہ ملیہ کا قیام تحریک عدم تعاون کے نتیجہ میں عمل میں آیا۔ اس کا تاسیسی جلسہ ۲۹؍اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی عالیشان جامع مسجد میں منعقد ہوا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب نے جلسہ کا افتتاح فرمایا۔ آپ اس وقت انتہائی ضعیف اور علیل تھے اس لیے آپ کا خطبۂ افتتاحیہ آپ کے شاگرد رشید مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھ کر سنایا۔ اس جلسہ میں مہاتما گاندھی، حکیم اجمل خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے اکابر ملت کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ اور طلبہ نے بھی کثیر تعداد میں شرکت کی تھی۔ اس طرح علی گڑھ اور دیوبند کے اشتراک سے ایک نیا ادارہ وجود میں آیا جس سے دونوں مکاتیب فکر کا ایک سنگم بن گیا۔ اسی تاسیسی جلسہ میں جامعہ کو عملی شکل دینے کی غرض سے ۷۰ افراد پر مبنی ایک فاؤنڈیشن کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس میں حلقۂ دیوبند کے علماء خاصی بڑی تعداد میں شامل کیے گئے تھے۔ ان میں مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد صاحب مدنی، مفتی کفایت اللہ صاحب کے اسماء گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح صوبۂ بہار کی بھی کئی اہم اور معتمد شخصیات کو اس کمیٹی میں شامل کیا گیا تھا ان میں بیرسٹر مظہر الحق، ڈاکٹر سید محمود، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا نور الحسن صاحب (وکیل پٹنہ)، مولانا محمد

سجاد صاحب، جناب شفیع داؤدی اور جناب محمد زبیر (مونگیر) کے نام سرفہرست نظر آتے ہیں۔

جامعہ کے پہلے وزیٹر (Visitor) گاندھی جی بنائے گئے تھے جنہوں نے کافی طویل عرصہ تک عوامی چندے سے جامعہ کی کفالت کی۔ دوسرے عہدیداروں میں پہلے امیر جامعہ (چانسلر) حکیم اجمل خاں صاحب، پہلے شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) مولانا محمد علی بنائے گئے تھے۔ مولانا محمد علی نے ابتدائی زمانے میں جامعہ میں انگریزی اور تاریخ کی کلاسیں بھی لیں اور جامعہ کے لیے نیا نصاب تعلیم بھی تیار کیا۔

جامعہ علی گڑھ میں قایم ہوئی تھی اور تقریباً پانچ سال تک وہیں رہی۔ اس کے بعد ۱۹۲۵ء میں دلی منتقل ہوگئی۔ یہاں قرولباغ میں ایک کرایہ کے مکان میں اس کی نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ لیکن جلد ہی یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ مکان جامعہ کی روز افزوں ضرورتوں کو پورا نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے کئی کشادہ عمارتوں کی بیک وقت ضرورت ہوگی لہٰذا فوری طور پر اس طرف توجہ کی گئی۔ اور ملک کے مختلف حصوں میں فراہمی چندہ کے لیے وفود بھیجے گئے۔ سب سے زیادہ کامیابی ریاست حیدرآباد اور صوبۂ بہار میں ملی۔ چنانچہ قدیم شہر سے میلوں دور جمنا کے کنارے اوکھلا کے قریب پرسکون فضا میں جامعہ کے لیے زمینیں خریدی گئیں۔ اور یکم مارچ ۱۹۳۵ء بروز جمعہ جامعہ کی نئی عمارتوں کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ تعمیر کا کام ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی نگرانی میں بہت تیز رفتار سے ہوا۔ اور ایک سال کی مختصر مدت میں یہ عمارتیں اس قابل ہوگئیں کہ جامعہ کلی طور پر قرولباغ کی عمارت کو چھوڑ کر اس نئی عمارت میں منتقل ہوگئی۔ اس نئی بستی کا نام تمام لوگوں کے مشورے سے جامعہ نگر رکھا گیا۔

یوں تو تحریک جامعہ سے تعلق رکھنے والے تمام حضرات معتقدر اور بزرگ تھے اور ملک و ملت کے لیے ان کی خدمات کو کسی طرح بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ان میں کئی لحاظ سے ڈاکٹر ذاکر حسین کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ آپ ۱۹۲۰ء میں ہی جامعہ سے متعلق ہوگئے تھے۔ بلکہ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ کالج میں عدم تعاون کے سلسلے میں جو تاریخی جلسہ منعقد ہوا تھا جس میں گاندھی جی کی رہنمائی میں ملک کے صف اول کے لیڈروں نے شرکت کی تھی، اس کے نتیجہ میں جن طالب علموں نے علی گڑھ کالج سے ناطہ توڑا تھا، ان میں اولین طالب علم ذاکر حسین ہی تھے۔ اور جن حضرات نے جامعہ قایم ہونے کے معاً بعد تدریسی خدمات انجام دیں

ان میں ذاکر صاحب بھی شامل تھے۔ وہ ۱۹۴۸ء تک براہ راست جامعہ سے وابستہ رہے۔ پہلے لکچرر کی حیثیت سے، پھر وائس چانسلر کی حیثیت سے۔ ۱۹۴۸ میں وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنائے گئے۔ پھر بہار کے گورنر ہوئے، ۱۹۶۲ء میں نائب صدر جمہوریہ ہند منتخب ہوئے اور ۱۹۶۷ء میں آپ نے ہندوستان کی مسند صدارت کو رونق بخشی۔ یوں بظاہر وہ جامعہ سے دور ہوتے چلے گئے۔ لیکن ذہنی طور پر انہوں نے خود کو کبھی جامعہ سے الگ نہیں کیا۔ وہ زندگی کے آخری لمحات تک جامعہ کی ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ذاکر صاحب کی انتھک کوششوں، پروفیسر محمد مجیب اور پروفیسر عابد حسین جیسے رفقائے کار کے بھرپور تعاون اور گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کی سرپرستی کے طفیل جامعہ نے بڑی تیزی سے ترقی کی اور بہت جلد ملک کے تعلیمی اداروں میں نمایاں مقام حاصل کرلیا۔

جامعہ کی تحریک ایک قومی و ملی تحریک تھی۔ یہ تحریک حکومت وقت کے خلاف چلائی گئی تھی۔ اس سے متعلق تمام حضرات نیشنلسٹ خیالات کے حامل تھے۔ اسی لیے جامعہ کی فضاؤں میں جدوجہد آزادی کی گونج سنائی دیتی تھی۔ یہاں کے اساتذہ اور طلبہ سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اس کی وجہ سے ہماری تحریک آزادی کو بڑی تقویت ملی۔ اس کے فرزندوں نے نہ صرف ہندوستان کی آزادی میں نمایاں حصہ لیا بلکہ آزادی کے بعد جدید ہندوستان کی تعمیر میں بھی مثبت کردار ادا کیا۔

مختصر یہ کہ وہ چاہے دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے علماء و فضلا ہوں، یا علی گڑھ اور جامعہ کے اکابر اور فرزندان عالی مقام ہوں، سب نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بیشتر مواقع پر رہنمائی کے فرایض انجام دیے۔ ان مجاہدین حریت نے مذہب، ادب اور سیاست، غرض ہر میدان میں پائمردی کی اور ہر موڑ پر دیرپا نقوش چھوڑے۔ ان میں سے چند حضرات نے خالص سیاست کو اپنی آماج گاہ بنایا، کچھ نے محض ادب و شاعری کو اور کچھ ایسی ہمہ گیر شخصیات بھی میدان کارزار میں آئیں جنہوں نے مذہب، ادب اور سیاست تمام میدانوں میں بیک وقت قدم رکھا اور کامیاب و کامران ہوئے اور عوام و خواص کے دلوں میں جذبۂ حریت کو بیدار کیا۔ علمائے کرام نے انگریزی حکومت، جسے وہ غیر اسلامی، مسلم دشمن اور وطن دشمن تصور کرتے تھے، اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کو مسلمانوں کے لیے مذہبی فریضہ قرار دے کر آزادی کی تحریک کو مذہبی بنیاد فراہم کی۔ اسی کے

ساتھ انہوں نے خطابت کے جوہر بھی دکھائے۔ انہوں نے لوگوں کے دلوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کی اور انہیں عملی میدان میں قدم رکھنے پر مجبور کیا۔ اسی طرح ہمارے شعرا نے بھی بڑی خوش اسلوبی سے اپنا فرض ادا کیا۔ انہوں نے قومی شاعری کی اور اپنے وطنی نغموں سے لوگوں کے دلوں میں جوش و ولولہ پیدا کیا۔ اس کی پاداش میں ان مقدس نفوس پر ظالم و جابر حکومت نے بغاوت کا الزام عاید کیا۔ ان پر بے بنیاد مقدمات چلائے، انسانیت سوز سزائیں دیں، کئی کئی سال تک جیلوں میں بند رکھا، ہر طرح سے ان پر عرصۂ حیات تنگ کیا، لیکن ان آزادی کے متوالوں کو زیر نہ کر سکے، ان کا جذبۂ حریت دبا نہ سکے، اور نہ آزادی وطن کی تڑپ کو کچل سکے۔ یہ حضرات ہر مرحلہ پر ثابت قدم رہے اور جان کی پرواہ کیے بغیر میدان میں ڈٹے رہے۔ اور اپنے خون جگر سے اپنے وطن عزیز کی آبیاری کرتے رہے۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوے